پب جی (PUBG) گیم کا جنون اور اسکے نقصانات

آصف جلیل احمد

ٹیکنالوجی میں پے در پے تبدیلیوں نے ویڈیو گیمز کے ایسے در کھولے ہیں جہاں ایک طرف بہت سارے فوائد نظر آرہے ہیں وہیں بہت سارے نقصانات نے بھی سر ابھارا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ نے نوجوان اور بچوں کے لئے ویڈیو گیمز کو انتہائی سستا اور آسان کر دیا ہے۔ ایسے ہی لاکھوں گیم میں پب جی گیم سے ہر کس وناکس متاثر ہو رہا ہے۔ بچے کیا نوجوان طبقہ بھی دن رات بیشتر وقت ایسے گیم کھیلنے میں صرف کر رہے ہیں، یہ گیم کھیلنے والوں کی صحت کیلئے مضر رساں ہے۔

گیم بنانے والے کمپنی فن لینڈ کی فرم سُپر سیل اور ساوتھ کوریا کی جانب سے بتایا گیا ہے کہ اِس پب جی ویڈیو گیم میں موجود اینی میشن کی روشنی سے نکلنے والی شعاعیں کثرت سے گیم کھیلنے والوں میں مرگی کا عارضہ پیدا کر دیتی ہیں اور یہ بھی خبردار کیا ہے کہ یہ اور اِس جیسے ویڈیو گیم بہت زیادہ کھیلنے سے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ انتباہ بھی دیا ہے کہ گیمز میں برق رفتاری کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے ہڈیوں اور عضلات کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں موبائل پر انگلیوں کی مسلسل حرکت کی وجہ سے ابہام والی انگلی کو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے ویڈیو گیمز کھیلتے ہوئے آنکھوں کی حرکت تیز ہو جانے کی وجہ سے آنکھوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ مقناطیسی لہریں موبائل اسکرین سے نکلتی رہتی ہیں جسکی وجہ سے آنکھیں سرخ اور خشک ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ یہ گیم کھیلنے والوں میں خود اعتمادی کی کمی کے ساتھ نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔ پب جی گیم میں ایسا ہے جس میں گروپ کی شکل میں دوسروں کو قتل کر کے انکی املاک تباہ کر کے ناحق انہیں زدوکوب کر کے لطف اٹھایا جاتا ہے۔

مکمل گیم اختتام تک کھیلنے والوں کو ایک فرضی چکن ڈنر انعام ملتا ہے۔ بچے اور خاص طور پر نوجوان نسل اس قسم کے ویڈیو گیمز کثرت سے کھیل کر جرائم کے نت نئے طریقے اور ترکیبیں سیکھ لیتے ہیں، یہ گیمز انکے ذہنوں میں تشدد، مار دھاڑ اور لڑنے جھگڑنے کے ایسے ہنر پیدا کر دیتے ہیں جن سے وہ ویڈیو گیمز کے کھیلنے سے پہلے خالی الذہن ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ ایسا گیم ہے جس سے خونریزی اور جرائم کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔

گیم کھیلنے والوں کو ایک ایک ہتھیار، بندوق، گن کا نام ازبر ہو جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اِس گیم میں منشیات کا استعمال، تشدد، مار دھاڑ، چھُپ چھپا کر قتل کرنا، گروہوں کے درمیان لڑائی، نازیبا اور عامیانہ الفاظ کا استعمال عام بات ہے۔ عام فرد کے لیے وہ تصورات اور الفاظ جن کو پہلے کبھی سوچنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اب وہ ان گیمز کے ذریعے زندگی میں رچتے بستے جا رہے ہیں، اور معاشرہ ان کے کثیر استعمال کے باعث انہیں قبول کر کے اپنے اندر ضم بھی کر رہا ہے۔

تشدد، مار دھاڑ اور جنگ کے مناظر عام افراد خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی صحت پر کیا اثرات مرتب کریں گے اس سے موبائل اور گیم کمپنیوں کو کوئی سروکار نہیں۔ لیکن یہ سوال معاشرے کے لیے بے حد اہم ہے کہ پُرتشدد اور اخلاق باختہ ویڈیو گیمز کے پھیلاؤ کے بعد اس قوم کا اخلاقی مستقبل کیا ہو گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان چیلنجز اور مسائل کو نمٹنے کے لیے اور اپنے بچوں کو ان چیزوں کے معاشرتی منفی اثرات سے بچانے کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کریں تا کہ ہمارا یہ مستقبل محفوظ پروان چڑھ سکے۔ ورنہ ایسے موبائل گیم اور انٹرنیٹ کے سائے میں پروان چڑھنے والی نسل کے لیے ادب، اخلاقیات، انکساری، تحمل، صبر، حیا اور دردمندی جیسے الفاظ عجوبہ بن جائیں گے۔ اور آنے والی نسلیں ان الفاظ کے استعمال پر حیرت سے منہ تکیں گی۔

سرِ نوشتے

آؤ غبار راہ میں...

جانے کہاں تھے اور چلے تھے کہاں سے ہم
بیدار ہو گئے کسی خواب گراں سے ہم
اے نو بہار ناز تری نکہتوں کی خیر
دامن جھٹک کے نکلے ترے گلستاں سے ہم
پندار عاشقی کی امانت ہے آہ سرد
یہ تیر آج چھوڑ رہے ہیں کماں سے ہم
آؤ غبار راہ میں ڈھونڈیں شمیم ناز
آؤ خبر بہار کی پوچھیں خزاں سے ہم
آخر دعا کریں بھی تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم

احمد ندیم قاسمی

کتاب سے موبائل ایپ تک

عارف کسانہ

اس حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ انسانی ترقی اس علم کے مرہون منت ہے جو کتابوں سے نسل در نسل چلا۔ اہل مغرب اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں یورپ کو تاریک دور سے ان کتابوں نے نکالا جو مسلمان سائنس دانوں اور اہل علم نے لکھی تھیں۔ یورپی اقوام نے اس راز کو پالیا کہ ترقی اور خوش حالی علم کے بغیر ناممکن ہے اور کتاب ہی علم کے حصول کا بنیادی ذریعہ ہے۔ دو دہائیاں قبل جب پاکستان سے سویڈن منتقل ہوا تو یہاں کے لوگوں کو مطالعہ کا دلدادہ پایا۔ بسوں، ٹرینوں، انتظار گاہوں غرض ہر جگہ کتاب ضرور ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

سویڈن ہی نہیں تمام یورپی باشندے کتابوں کے مطالعہ کے رسیا نظر آئے۔ یہ لوگ محو سفر ہوں یا کہیں بیٹھے، اس قدر انہماک سے کتابوں کے مطالعہ میں مگن ہوتے ہیں جیسے یہ کسی امتحان کی تیاری کر رہے ہوں۔ اہل مغرب میں مطالعہ کا شوق بچپن سے پیدا کیا جاتا ہے جو عمر بھر ان کے ساتھ رہتا ہے۔ سائنسی ترقی اور انٹرنیٹ کی آمد نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے اور وہی اہل یورپ جن کے ہاتھوں میں ہمیشہ کتاب ہوتی تھی لیکن اسمارٹ فون نے ان کے ہاتھوں سے کتاب چھڑا دی ہے۔

اب ہر کوئی اپنے ہاتھوں میں اسمارٹ فون لئے ہوتا ہے جو دور جدید کی اہم ایجاد ہے مگر اس کے باوجود ان لوگوں کے مطالعہ کا شوق کم نہیں ہوا۔ صرف فرق یہ ہوا کہ کتاب اوراق کی بجائے ایپ کی صورت میں اسمارٹ فون میں کتاب سما گئی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اشاعتی اداروں نے اپنی کتابوں کو جدید ڈھنگ سے پیش کرنا شروع کر دیا ہے اور زمانے کے تقاضوں اور لوگوں کی دلچسپی کے پیش نظر اب کتابیں برقی انداز میں اور موبائل ایپ کی صورت میں دستیاب ہیں۔

بچے جدید ٹیکنالوجی سے بہت رغبت رکھتے ہیں اور ان ذرائع کو استعمال کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو نئے انداز سے پیش کئے جائیں۔ کتاب کی افادیت اپنی جگہ ہے اور بچوں کا تعلق اس سے قائم رہنا چاہیے لیکن پھر بھی ان کے میلان کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈنمارک میں مقیم ایک نوجوان اور ہونہار پاکستانی مدثر علی اور ان کے ساتھیوں نے بچوں اور والدین کے لئے ایک اہم موبائل ایپ تیار کی ہے۔

مدثر علی آئی ٹی کے ماہر ہیں اور کوپن ہیگن میں ایک بین الاقوامی ادارے میں اہم فرائض ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے اسلامی معلومات پر مبنی 'سبق آموز کہانیاں'' کے لئے موبائل ایپ تیار کیا ہے۔

سبق آموز کہانیاں کو ملک کے سب سے بڑے، معتبر اور سرکاری اشاعتی ادارے، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے اسے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی پذیرائی اور مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے بعد اب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ مزید براں یہ اردو میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی واحد کتاب ہے جس کے دنیا کے بہت سی زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ سبق آموز کہانیاں اردو کے بعد انگریزی، عربی، فارسی، فرانسیسی، ہندی، نارویجین اور بنگالی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

سندھی، ڈینش، جرمن اور گوجری زبانوں میں ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور اشاعت کے مراحل میں ہے جبکہ جاپانی، سویڈش، ہسپانوی، پشتو، چینی، روسی، اطالوی اور دیگر بہت سی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور امید ہے کہ جلد ہی سبق آموز کہانیاں ان زبانوں میں بھی دستیاب ہوگی جس سے دنیا بھر کے بچے فائدہ اٹھا سکیں۔ بہت سے مبصرین نے سولہ کہانیوں پر مشتمل ''سبق آموز کہانیاں'' کو بچوں اور والدین کے لیے ایک علمی و معلوماتی خزانہ قرار دیتے ہوئے اسے کو سراہا ہے۔ ''سبق آموز کہانیاں'' ان سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے جو بچوں کے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ دور جدید میں بچے اپنے دین وثقافت کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔

بچوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوال آتے رہتے ہیں اور وہ ان کے جواب چاہتے ہیں۔ معصوم ذہنوں میں آنے والے سوال ہوتے تو بہت چھوٹے اور سادہ ہیں لیکن ان کے جواب بعض اوقات اتنے بھی آسان نہیں ہوتے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالوں کے ایسے جواب دیئے جائیں تا کہ وہ مطمئن ہو جائیں۔ بچوں کو ان کی عمر اور فہم کے مطابق ایسا جواب دینے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی تسلی ہو جائے۔ یہ کتاب لکھنے کا بڑا مقصد یہ تھا کہ بچے جو مستقبل کے معمار ہیں ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ سچے مسلمان، اچھے انسان، محب وطن اور باوقار شہری بنیں۔ ان کے ذہن میں کوئی الجھن نہ ہو۔ وہ اپنے دل اور دماغ کے اطمینان کے ساتھ اپنے دین کی تعلیمات کو سمجھیں اور ان پر عمل کر کے اپنی زندگی بسر کریں۔ یہ کہانیاں اس انداز سے لکھی گئی ہیں کہ بچے انہیں دلچسپی سے پڑھیں۔ سبق آموز کہانیاں اب Islamic Stories For Kids کے نام سے موبائل ایپ کی صورت میں ہر قسم کے اسمارٹ فون اور ٹیبلٹ کے لئے دستیاب ہے۔ اس موبائل ایپلیکیشن میں سبق آموز کہانیاں آٹھ زبانوں میں پڑھنے کی سہولت موجود ہے۔ بچے اور والدین اردو، انگریزی، عربی، فارسی، ہندی، بنگالی، فرانسیسی اور نارویجین زبانوں میں تمام کہانیاں پڑھ سکتے ہیں۔ بچوں کی دینی تربیت اور اسلام کی بنیادی معلومات کے لئے یہ بہترین کوشش ہے جس سے بچے اور والدین ضرور فائدہ اٹھا سکیں گے۔

سبق آموز کہانیاں شائع ہونے کے بعد بچوں اور والدین کی جانب سے مزید سوالات اور اصرار نے مجھے سبق آموز کہانیاں کا دوسرا حصہ لکھنے پر آمادہ کیا اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت مسرت ہو رہی ہے کہ الحمدللہ سبق آموز کہانیاں 2 مکمل ہو گئی ہیں اور امید ہے کہ یہ بھی جلد ہی شائع ہو سکیں گی۔ اس میں بیس کہانیاں شامل ہیں اور توقع ہے کہ سبق آموز کہانیاں کا دوسرا حصہ بھی بچوں اور والدین میں بہت مقبول ہوگا۔

سوشلسٹ رہنما، مصنف

سید شاہ نواز احمد قادری

کی تصنیف 'لہو بولتا بھی ہے' جس میں جنگ آزادیٔ ہند کے ان مسلم کرداروں کو منظر عام پر لایا گیا ہے جنہیں فرقہ پرست سیاستدانوں کی سازشوں سے تاریخ کی کتابوں سے کھرچ کر نکال دیا گیا تھا۔

'سنڈے آگ' تاریخ کے اس بیش قیمتی سرمایہ کو اپنے محبوب قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

(قسط-۴۶)

حسرت موہانی ابھی قید میں ہی تھے کہ بیگم حسرت نے وزیر ہند سے ملاقات کرنے والے ہندوستانی خواتین کے ایک وفد کے ہمراہ شرکت کی۔ اس شرکت کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ نشاط النساء بیگم نے ملاقات کے وقت جس ہمت اور بہادری سے اپنی بات رکھی، وہ اکیلے ہی آپ کے کردار کی بلندی کے لئے کافی ہے۔

1919 وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سیاسی زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ بیگم حسرت کے کردار اور قومی محاذ پر ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے بی اماں جیسی آزادی کی عظیم مجاہد کی نظر میں ان کے لئے کتنی عزت تھی اس کا پتہ محترمہ اوما نہرو کے نام لکھے ان کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ جس میں 13/دسمبر 1917 کو لکھا تھا کہ اخبارات سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اس بہادر اور پیاری بیٹی نشاط النساء بیگم کے ساتھ مجھے بھی خواتین کے اس وفد کی قیادت کرنی ہے، جو تمام خواتین ہند کی طرف سے جناب وزیر ہند سے ملنے کے واسطے اس مہینے کی 18/تاریخ کو مدراس میں طے ہوا ہے۔

اس تمام تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ قومی جنگ آزادی میں بیگم حسرت موہانی کی قربانیوں، ان کی ہمت بہادری اور ملک کے لئے محبت کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کی قوتِ ارادی کی فولاد جیسی ہمت ہر چٹان سے ٹکرانے کے لئے کافی تھی۔

31۔ منیرہ بیگم

منیرہ بیگم بہار کے ممتاز شاعر اور رہنما مظہر الحق کی بیوی اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بدرالدین طیب جی کی بھتیجی تھیں۔ آپ کا نکاح 1917 میں مولوی مظہر الحق صاحب سے ہوا تھا۔ آپ کا تعلق پٹنہ کے ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا۔ آپ نے لندن سے بار ایٹ لا کیا اور وہیں گاندھی جی، علی امام اور سچیدا نند سنہا کے قریب آئیں۔ آپ نے پٹنہ سے باہر بغہا کے محاذ پر ستیہ آشرم کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد آپ نے غیر ملکی لباس اور ہر طرح کے عیش و آرام کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی گزاری۔

اکبر حیدری کے نام گاندھی جی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیرہ بیگم نے قوم و وطن کی خاطر اس بڑی قربانی میں اپنے شوہر کا پورا ساتھ دیا۔ خط اس طرح لکھا گیا تھا۔

''پیارے دوستو! ہم ابھی بانکی پور پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ مظہر الحق ہمارے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے ذہن میں لانا چاہتا ہوں کہ پچھلی رات میرے ذریعہ بلائی گئی عورتوں کی میٹنگ میں بیگم مظہر الحق نے اپنے چار جوڑی ہیرے کے کنگن ہمیں دیئے ہیں۔ کیا آپ بیگم حیدری کو ایک ایسی عورت کی بہن ہونے پر مبارکباد پیش کریں گے جو ملک وقوم کے خاطر اتنی بڑی قربانی دے سکے؟—— جب انہوں نے مجھے کنگن پیش کئے تو میرا دل خوشی سے بھر آیا اور میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا، جس نے مجھے طیب جی کے کنبہ کے پاس آنے کا موقع دیا۔

32۔ عابدی بانو بیگم (بی اماں)

آپ کی پیدائش 1852 میں امروہہ (مراد آباد) میں ہوئی تھی۔ آپ کی شادی رام پور اسٹیٹ کے عبدالعلی خاں صاحب سے ہوئی تھی۔ آپ کے شوہر کا انتقال جوانی میں ہی ہو گیا تھا۔ آپ کے ۲/بیٹے تھے۔ محمد علی اور شوکت علی۔ دونوں ہی چھوٹے تھے۔ یہ وہی دو بچے تھے جو آگے چل کر علی برادران کے نام سے ہندوستان کی جنگ آزادی میں مشہور ہوئے۔ 19 ویں صدی کے مسلم معاشرہ میں بیوگی اور پردے داری کے باوجود اپنی جائیداد کے انتظام، بچوں کی پرورش اور انہیں اعلیٰ تعلیم دینا واقعی مشکل کام تھا۔ مگر اس دور میں بی اماں نے جانبازی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا اور دقیانوسی فکر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ میرے بچوں کو ان کا مکمل حق ملے، تا کہ وہ اپنی ماں کو الزام نہ دے سکیں۔

مولانا محمد علی کی تربیت اور شخصیت بھی بی اماں کی وجہ سے تھی، جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے، کہ مجھے اپنے والد بالکل یاد نہیں، مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں یا جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ مجھے اپنی والدہ (بی اماں) سے ہی ملا ہے۔

بی اماں کا سیاسی سفر پہلی جنگ عظیم سے شروع ہوتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر جگہ ہوم رول لیگ کا چرچا تھا۔ لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بیسنٹ کی سرپرستی میں مہاراشٹر ہوم رول لیگ کی شاخ ملک میں تیزی سے پھیل رہی تھی۔ بی اماں نے بھی ہوم رول لیگ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے لکھا تھا کہ میں نے اپنے گھر کے تمام لوگوں کے ساتھ اس لیگ کی ممبری کا حلف لے لیا اور خود آگے بڑھ کر خلافت اور نان کوآپریٹیو مومنٹ کی قیادت کی۔ آپ میٹنگوں میں تقریر کرتی تھیں تو لوگوں میں جوش پیدا ہوتا تھا۔ 1917 کے کانگریس اجلاس میں بھی شریک رہیں۔ 1919 کے مومنٹ کی قیادت بھی کی۔ آپ کو انگریز افسر خطرناک لیڈر کے نام سے نوازتے تھے۔ آپ کے اندر انسانی ہمدردی، وطن پرستی اور ملک کی آزادی کا جنون کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آزادی ایک نعمت ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے انسان سب کچھ کر گزرتا ہے اس نازک موقع پر بڑے بڑے بہادر مردوں کے قدم لڑکھڑا گئے لیکن مجاہد بیٹوں کی اس ماں نے جس ثابت قدمی، ہمت وجرأت کا مظاہرہ کیا، وہ ملک پرستی کی روشن مثال ہے۔ بی اماں نے ہی اس زمانے میں بڑے گھروں کی پردہ نشین بہن بیٹیوں کو اپنی جوشیلی تقریروں سے جنگ آزادی میں شامل کرایا۔ آپ ہر مجاہد کی ماں بنی رہیں۔ اور جنگ آزادی کا ہر نوجوان بی اماں سے کوئی بھی مدد کسی بھی وقت لے سکتا تھا۔ آپ کو گاندھی جی بھی امی جان کہتے تھے۔ اس بہادر مدر انڈیا کا 13/نومبر 1924 کو انتقال ہوا۔

33 ریحانہ طیب جی

ریحانہ طیب جی کی پیدائش 26/جنوری 1900 کو ہوئی تھی۔ آپ ریاست بڑودہ (گجرات) سے تعلق رکھتی تھیں اور مشہور قومی رہنما اور بڑودہ کے جج عباس طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ امینہ طیب جی نے بھی اپنے ملک کی آزادی کے لئے کافی قربانیاں دیں ہیں۔

ملک کے خاطر قربانی کا جذبہ انہیں اپنے والد سے ہی ملا تھا اور جنگ آزادی کی تحریک میں شروع سے ہی آپ آگے آگے رہیں۔ انہوں نے بی اے کیا—— انگریزی، گجراتی، ہندی اور اردو کی انہیں بہتر معلومات تھی۔ ریحانہ طیب جی نے مینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی کام کیا تھا۔ اپنے خط میں گاندھی جی نے انہیں لکھا تھا کہ مینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جو تمہیں کام مل گیا ہے تو وہ بہت اچھا ہے۔ اب تو ریحانہ اسکالر کہلائیں گی۔ وہ آسمان میں اڑیں گی اور ہم سب دیکھتے رہیں گے۔

گاندھی جی کو ریحانہ طیب جی کتنی عزیز تھیں، اس کا اندازہ ان کے ان خطوط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے ریحانہ کو ''بیٹی ریحانہ'' استانی صاحبہ'' پاگل ریحانہ''،''شریف لڑکی''، اور ''بھلی بیٹی'' جیسے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔

ریحانہ طیب جی نے بچپن سے ہی صوفیانہ مزاج پایا تھا۔ انہوں نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ اسلامی وہندو فلاسفی پر آپ گہری نظر رکھتی تھیں اور مذہبی سچائیوں پر آپ کو پورا یقین تھا۔ آپ شاردا بل کی حمایت میں بھی پیش پیش رہیں۔ گاندھی نے ایک بار لکھا تھا کہ ریحانہ طیب جی کچھ دنوں کے لئے سیوا گرام میں ہمارے پاس رہنے آئی تھیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک سچی مسلمان ہیں ان کے والد کے انتقال سے پہلے مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن شریف کی اتنی اچھی قرأت بھی کرسکتی ہیں۔ جب گجراتی ہیرو، ان کے والد عباس طیب جی کا انتقال ہوا تو کمرے کی گہری خاموشی کو توڑتی ہوئی سسکیوں میں ریحانہ کی قرأت گونج رہی تھی۔ عباس طیب جی جیسے لوگ کبھی مر نہیں سکتے۔ ملک کے خاطر ان کی قربانیاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

بی بی ریحانہ گاتی بھی بہت اچھا تھیں۔ ہر طرح کے بھجن انہیں یاد تھے۔ وہ روزانہ بھجن بھی گاتی تھیں اور قرآن شریف بھی پڑھتی تھیں۔ آشرم کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ سب سے گھل مل گئی تھیں۔ وقت رہائش پورا ہونے پر ریحانہ واپس چلی گئیں، لیکن اپنے پیچھے ایک ایسی مہک چھوڑ گئیں جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی۔

ریحانہ طیب جی کے خاندان میں گاندھی جی ایک سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے، جنہیں وہ نہ صرف اپنے دل کی بات بتا سکتی تھیں، بلکہ اپنی ہر الجھن اور پریشانی سے انھیں شریک کرسکتی تھیں اور گاندھی جی بھی ان کو ہر طرح سے صلاح ومشورہ دیا کرتے تھے۔ (جاری)

لہو بولتا بھی ہے

جنگ آزادیٔ ہند کے مسلم کردار

سید شاہ نواز احمد قادری

کرشن کلکی